⊙ ڈاکٹر محمد رحمان
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ

رشید احمد صدیقی اور علی گڑھ

Abstract:

Rashid ahmad siddiqui was born in Junpur but he completed most of his education from Aligarh. His opinion about Aligarh is of high esteem and this is what he always talks about Aligarh in his work. One reason of his attachment to Aligarh was due to the fact that although he was not born there but got grown along with educational learning. This research article discusses all about Rashid Ahmed Siddiqui's literary work which is about Aligarh. This research throws light on attachment of Rashid Ahmed Siddiqui to Aligarh..

Keywords:

Rashid Siddiqui Aligarh Attachment Education Emotional

رشید احمد صدیقی کی جائے پیدائش اگرچہ جون پور کا قصبہ مڑیا ہو ہے لیکن علی گڑھ سے ان کو بہت جذباتی وابستگی ہے۔ایسی مثال اردو ادب میں بہت کم ملتی ہے۔کسی اور ادیب نے اپنے وطن کے علاوہ کسی اور مقام کو اس قدر شدّت کے ساتھ شاید ہی چاہا ہو۔یہاں تک کہ اپنے کیریئر کے بننے میں بھی وہ علی گڑھ کو سراہتے ہیں۔اس قسم کے خیالات کا اظہار ان کے ہاں اکثر ملتا ہے۔ان کی علمی شخصیت کا جائزہ لینے سے ان کی علی گڑھ سے عقیدت کے اسباب کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔رشید احمد صدیقی نے علی گڑھ کو صرف مادرِ علمی ہی نہیں سمجھا بلکہ علی گڑھ میں ان کو سب کچھ نظر آتا تھا۔یہ ان کا محبوب بھی تھا، رہبر بھی تھا، تحریروں اور تقریروں کا مرکز بھی تھا۔غرض سب کچھ تھا۔اس سے ان کو جنون کی حد تک عشق تھا۔ان کا سونا جاگنا، چلنا پھرنا سب کچھ علی گڑھ کے لیے تھا۔وہ ہمہ وقت علی گڑھ کے لیے جینے مرنے کے لیے تیار تھے اور اس کی عظمت وعزت پر ہر وقت مرمٹنے کے لیے کمربستہ رہتے تھے۔ان کی کوئی تحریر مشکل سے ایسی ملے گی جس میں علی گڑھ کی عظمت اور وہاں کی سرگرمیوں کا والہانہ انداز میں تذکرہ نہ ہو۔ان پر علی گڑھ پرستی کا الزام لگایا گیا۔ان کی تحریروں میں علی گڑھ کے بار بار ذکر کو نقص بتایا گیا لیکن انہیں کسی کی پرواہ نہیں تھی اور وہ آخری دم تک علی گڑھ سے عشق کا دم بھرتے رہے۔علی گڑھ سے ان کی محبت کا ثبوت یہ ہے کہ ان کی آخری آرام گاہ بھی اپنے وطن کے بجائے یہیں پر ہے۔

اس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ جسے علی گڑھ تہذیب کہتے ہیں یا کم از کم جو رشید احمد صدیقی کو علی گڑھ

تہذیب نظر آتا ہے۔ اس کا خمیر کس طرح تیار ہوا تھا۔ رشید صاحب کے خیال میں یہ مجموعہ تھا ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے اسلامی عناصر اور اسلامی تہذیب کے ہندوستانی عناصر کا۔ اس بحث کی ضرورت نہیں کہ ہندوستان میں صرف ایک تہذیب یا کئی تہذیبیں ہیں اور ان کا مذہب سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ رشید صاحب کے ذہن میں ''علی گڑھ تہذیب'' کی بنیاد اسلامی ہے اور یہ اسلامی ہندی ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی تہذیب کی بے پناہ قوتِ جاذبہ نے ہندی تہذیب سے صالح اور حسین اقدار جذب کر کے جس اسلامی ہندی تہذیب کی بنیاد ڈالی تھی اس کے نمائندے وہ سبھی تھے جنھوں نے اس دور کے ہندوستان میں ملک و ملت کی خدمت کی اور اس کے لیے اپنی صلاحیتیں وقف کر دی تھیں۔ ان میں علی گڑھ کا بھی حصہ رہا ہے۔ اس کی ایک جھلک رشید صاحب کے مضامین میں مل جاتی ہے۔ یہ لوگ سبھی کسی نہ کسی حیثیت سے علی گڑھ سے وابستہ تھے۔ یہ انفرادی طور پر تہذیب کی کسی ایک جہت ہی کی نمائندگی کرتے تھے لیکن اجتماعی طور پر ان کا وحدتِ تصور ایک تھا۔ یہ تصور اتنا نظریاتی نہیں تھا جتنا حسی اور تاثراتی۔ اسی لیے تجربہ و تحلیل کی گرفت سے گریزاں تھا۔ یہ اسی وحدت تاثر و تصور کا نتیجہ تھا کہ آزادی کے بعد بھی ایک طرف ذاکر صاحب اور سہیل صاحب اور دوسری طرف رشید صاحب ''علی گڑھ تہذیب'' کے ایک ہی سکے کے دو رخ معلوم ہو رہے تھے۔ ان کو دیکھنے سے اربابِ نظر کو ایک تہذیبی مینار کی زیارت نصیب ہوتی تھی۔ یہاں یہ تشریح ضروری ہے کہ ایک طرف ہوتے ہوئے بھی ذاکر صاحب، سہیل صاحب اور رشید صاحب بالکل ایک طرف نہیں تھے۔ ذاکر صاحب تحریک آزادی کے تعلیمی محاذ کے لیڈروں میں اور بنیادی اور تعمیری تعلیم کے نظریہ سازوں میں تھے۔ انہوں نے آزادی سے پہلے مادر درسگاہ کو خیر باد کہہ کر اسی علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگِ بنیاد رکھا اور گاندھی جی کے تعلیمی مقاطعے کے پروگرام میں عملی طور پر شریک ہو کر ''علی گڑھ تہذیب'' کو ایک میان میں دو تلواروں کے مترادف بنا دیا۔ اقبال احمد سہیل نے شاعری کی غزلیہ غنائیت میں قومی سیاست کی معنویت بھری اور عملی سیاست میں حصہ لینے لگے۔ رشید صاحب بے حد قریبی تعلقات اور ذاکر صاحب کو مرشد کہنے کے باوجود اور سہیل کی عظمت کے قائل ہونے کے باوجود علی گڑھ کی اکثریت کی طرح پرانی ڈگر پر چلنے کو ترجیح دیتے رہے اور ''وفاداری بشرط استواری'' کو اصل ایمان سمجھتے رہے۔ اس وفاداری کا مرکز ذاکر و سہیل کے نظریات نہ تھے بلکہ وہ ''علی گڑھ تحریک'' کی روایت تھی۔

تقسیم برصغیر سے چند برس پہلے حالات نے کچھ ناخوش گواریت کی طرف پلٹا کھایا تھا۔ کچھ ایسے تکلیف دہ واقعات رونما ہوئے جو علی گڑھ تہذیب کو کسی طرح زیب نہیں دیتے تھے۔ رشید صاحب نے سیاسی محرکات سے بے پرواہو کر اس تبدیلی کو بڑے درد اور کرب کے ساتھ محسوس کیا۔ اور کئی موقعوں پر کھل کر اس کا اظہار بھی کیا۔ وہ اسے علی گڑھ تہذیب و روایت کا جز نہیں بلکہ اس کا زوال سمجھتے تھے۔ اگرچہ انہوں نے اس کی ذمے داری علی گڑھ پر نہیں بلکہ سیاسی محرکات پر ڈالی مگر علی گڑھ کو بری الذمہ بھی قرار نہیں دیا۔ وہ اس پر کھل کر کچھ نہیں لکھتے تھے لیکن رمز شناس روئے سخن کو پہچانتے تھے اور اس درد و کرب کی روحانی اذیت کو محسوس کر سکتے تھے۔ اس سے ان کی شخصیت کا یہ پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ وہ علی گڑھ کی جا و بیجا طرفداری اُسی حد تک کر سکتے تھے جہاں تک خود علی گڑھ کے امیج خراب ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ انہیں یہ تصور بے حد عزیز تھا اور ایسے لمحوں میں وہ دوست ہی کو ووٹ دینے کا نظریہ بھول جاتے تھے۔

یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رشید صاحب ''علی گڑھ تہذیب'' کو اسلامی تہذیب سمجھتے ہیں اور یہ اسلامی ہندی تہذیب

ہے۔اس ہندی اسلامی تہذیب کا نمائندہ علی گڑھ ہے۔ندوۃ العلماء، دارالعلوم دیوبند یا جامعہ ناظمیہ نہیں ہے۔ بہ الفاظِ دیگر رشید صاحب کا تہذیبی شعور علی گڑھ میں محصور ہے۔ان کے تصور کا یہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے متعلقہ اداروں سے بھی عبارت نہیں ہے۔ یہ ایک تہذیب ہے جسے سہولت اور شناخت کے لیے انہوں نے علی گڑھ کا نام دے دیا ہے۔ علی گڑھ ایک زمانے میں ایک تحریک سے وابستہ تھا۔ بعد میں یہ خود عارضی طور سے پھر تحریک سے وابستہ یا علیحدہ ہو کر اور کئی نشیب وفراز دیکھ کر ایک تہذیبی علامت بن گیا۔ وہ تہذیبی علامت جس کا ایک رخ ڈاکٹر ذاکر حسین تھے اور دوسرا رشید احمد صدیقی تھے یا پہلے سرسید اور شبلی نعمانی تھے۔اس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کی ذاتی ترجیحات کیا تھیں اور اس تہذیب کے کن پہلوؤں کو علی گڑھ سے قریب پاتے تھے۔ پھر بھی ان تصویروں میں ''علی گڑھ تہذیب'' کی مختلف الجہاتی جھلکتی ہے۔ کئی تصاویر ایک دوسرے میں مدغم ہوتی چلی گئی ہیں اور ایک عکس نما منظر پیش کرتی ہیں۔ یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علی گڑھ صرف ایک شہر نہیں ایک چھوٹے پیمانے پر اسلامی ہندوستان تھا۔ سیاسی اور علاقائی اعتبار سے بھی اقتصادی اور جمالیاتی اعتبار سے بھی اور نظریاتی اور مابعد الطبیعیاتی اعتبار سے بھی اور وہ اس مجموعی علی گڑھ کو سب سے بہتر و برتر سمجھتے تھے۔ یہ تہذیبی نفوذ انہیں ناگوار نہیں گزرتا تھا۔اس کا انہوں نے خود اقرار کیا ہے۔ رشید صاحب کی کئی تحریریں ایسی دستاویزات ہیں جس میں انہوں نے اپنے علی گڑھ کے تعلق کو لطف آمیز صداقت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں؛

> ''علی گڑھ نے کسی کام کا نہ رکھا، اس نے اپنا لیا، یہ بڑا ہی سخت گیر اور شکی محبوب ہے۔ نہیں چاہتا کہ اس کے ادنیٰ مطالبات سے بھی گریز کیا جائے یا اس کے سوا کسی اور سے التفات کیا جائے۔اس نے مجھے میری نظر میں محترم کر دیا۔اس قید سے خلاصی کہاں؟ بہت سی باتوں میں اب نہ علی گڑھ سے بہتر و برتر مجھے مقام نظر آتا ہے اور نہ علی گڑھ والوں سے بہتر و برتر لوگ''(۱)

ایک اور جگہ ان کے خیالات یوں ہیں:

> ''علی گڑھ کا ایک خاص رنگ، رکھ رکھاؤ یا ٹھپا ہوتا ہے جو اُسے دوسروں سے ممتاز یا متمائز کرتا ہے''علی گڑھ'' ایک علمی تعلیمی تہذیبی ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک قدر اعلیٰ کی بھی حیثیت رکھتا ہے''۔(۲)

رشید احمد صدیقی کے ہاں علی گڑھ کا ہر بیان اسی تہذیبی داستان کا ایک جزو اور ان کے تہذیبی شعور کا ایک نمونہ ہے۔ بہ الفاظِ دیگر علی گڑھ کی داستان اُن کے تہذیبی شعور کا پیمانہ ہے۔اس داستان سرائی میں انہوں نے پوری عمر گزار دی۔خود اُن کے الفاظ میں صورت حال کچھ یہ ہے؛

> ''میرے لئے یہ بتانا مشکل ہے کہ علی گڑھ کی دستان سرائی میرا پیشہ ہے، تفریح ہے یا عبادت ہے یا سب کچھ ایک ساتھ''۔(۳)

رشید احمد صدیقی بحیثیت مجموعی اس صحت مند فضا سے عقیدت رکھتے ہیں جو مادی وسائل کی کمی اور سیاسی محکومی کی سختی کے باوجود کالج کے مختلف النسل اور مختلف الخیال طالب علم، اساتذہ، منتظمین اور متعلقہ اشخاص کی آزادانہ، مخلصانہ و متفقہ کوششوں سے علی گڑھ میں قائم ہوئی لیکن وہ اس کے بنیادی اسلامی کردار پر زور دیتے رہتے ہیں اور علی گڑھ کی یہ حیثیت

کبھی ان کی نظروں سے اوجھل ہونے نہیں پائی۔ ان کی نگاہوں میں علی گڑھ کی تاریخ کا یہ پہلو اہم ہے کہ یہ تحریک اپنے محدود معنوں میں اسلامی نہیں تھی بلکہ ان کے الفاظ میں؛

''علی گڑھ تحریک ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے خاتمے کا ردعمل بھی تھی اور ایک جہانِ تازہ کا اعلان بھی۔۔۔علی گڑھ مشرقِ وسطیٰ کی اُس طرزِ فکر اور طریق بودوماند کا ایک طرح سے امین بنا جس کا ظہور سرزمینِ عرب سے ہوا اور صدیوں سے متمدن دنیا کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ اس طرز و طریق کو اس نے غیر نامی طور پر نہیں اپنایا تھا بلکہ اس میں ہندوستانی تہذیب کے ایسے قیمتی اور دل کش عناصر اس خوبی و خوب صورتی سے سموئے کہ ان کا ایک دوسرے سے جدا کرنا (اکثر پہچاننا) دشوار ہو گیا''۔(۴)

رشید صاحب کے ان بیانات کے سلسلے میں بعض توضیحیں ضروری ہیں۔ اول یہ کہ علی گڑھ تحریک مسلمانوں کی صفوں میں مغل حکومت کے زوال کا واحد ردعمل نہ تھی۔ ایسے عناصر بھی موجود تھے جو ''جہانِ تازہ'' پیدا کرنے لیے دوسری راہوں پر چل رہے تھے۔ جن میں دیوبند تحریک، ریشمی رومال تحریک اور عارضی حکومتِ ہند کے قیام کی تحریکیں شامل تھیں۔ مؤخرالذّکر تحریک میں غیر مسلم عناصر بھی نمایاں حصہ لے رہے تھے۔ علی گڑھ تحریک کی مخالفت بھی کئی سطحوں پر ہوئی۔ کچھ لوگ برطانوی حکومت سے (جسے وہ غاصب حکومت سمجھتے تھے) ہر مصالحت کو غلط مانتے تھے۔ کچھ لوگ جدید تعلیم اور روشن خیالی کے سرے سے دشمن تھے۔ اس کے لیے انہوں نے نیچریت اور دہریت کے ڈراؤنے نام تراشے تھے۔ تھوڑے سے لوگ اس بنا پر برانگیختہ تھے کہ علی گڑھ تحریک مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ بعض پہلوؤں سے سیکولر کیوں ہے۔ بعض طبقے درکار دوستی کی بنا پر پوری تحریک کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ فی الحال ان مخالفتوں کے اسباب و علل پر غور خوض ہمارے قلم کے دائرے سے باہر ہے۔ لیکن بقول رشید احمد صدیقی؛

''بانیانِ علی گڑھ نے ایک ایسی ہمہ گیر اور ہم آہنگ تہذیبی زندگی کی تشکیل و ترقی کو اپنا نصب العین قرار دیا جو ہندوستان کا نشانِ امتیاز مانا جاتا ہے اور جس کی بنا پر اس ادارے کو ایک اعلیٰ درسگاہ بالفاظِ دیگر تہذیبی ریاست کا درجہ حاصل ہوا۔ علی گڑھ کی اس تہذیبی ریاست کا قابلِ قدر اور شاندار کارنامہ اس طرزِ فکر اور طریق کار کو سمجھتا ہوں جس کی روئے خیالات و متعلقات کا، خواہ وہ کسی نوعیت کے کیوں نہ ہوں، جارحانہ یا مفسدانہ اظہار و ابلاغ قابل نفریں قرار پایا۔ اسی پالیسی کا نتیجہ تھا کہ علی گڑھ نہ صرف بنیادی طور پر مقامی یا علاقائی عصبیت اور مذہبی یا نسلی منافرت سے دور اور محفوظ رہا بلکہ اس نے ان فتنوں کا انسداد بھی کیا''۔(۵)

دوسرا حل طلب مسئلہ یہ ہے کہ ''علی گڑھ تہذیب'' کس حد تک اسلامی ہے؟ کس حد تک ہندی یا صرف ہند اسلامی ہے؟ یہاں بظاہر ایک تضاد نظر آتا ہے۔ ایک طرف یہ تہذیب مشرقِ وسطیٰ کے اس طرزِ فکر کے صالح عناصر سموئے ہوئے ہیں۔ لیکن ان میں کوئی تضاد نہیں بلکہ امتزاج ضدّین ہے۔ یہ امتزاج اسے ایک نئی معنویت بھی دیتا ہے اور اس ثقافتی مظہر کا جواز ذہنی بھی پیدا کرتا ہے جسے علی گڑھ تہذیب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں؛

''مذہب ایک معنی میں تو کل تہذیب پر حاوی ہے اور ایک معنی میں محض ایک جزو جہاں مذہب سے مراد روح مذہب ہو، یعنی وہ واردات جو ہم پر حیات و کائنات کی حقیقت اور اس کے مقصد کو منکشف کرتی ہے اور اسی مقصد کے اعتبار سے اقدار کو سند قبول بخشتی ہے۔ وہاں مہذیب کا حقیقی جوہر ہے اور ساری تہذیب اُسی کا ظہور۔ لیکن جہاں مذہب اس ہیئت معروضی کے معنی میں آئے جس میں واردات حقیقت مشخص ہوتی ہیں تو مذہب تہذیب کا محض ایک جزو ہے خواہ کتنا ہی اہم جزو کیوں نہ ہو مثلاً مذہب عیسوی کی روح، عہد وسطیٰ میں کل یورپی تہذیب کی روح رواں تھی مگر اس کی ہیئت معروضی یعنی رومی کلیسا اس تہذیب کا محض ایک جزو''۔(۶)

یہ باریک اور تقریباً غیر مرئی فاصلہ رشید صاحب کے یہاں اکثر گم ہو جاتا ہے۔ اگر اُن کا قاری چوکنا نہ رہے تو روح مذہب کی معروضی ہیئت کے باہم خلط ملط ہو جانے اور گم رہی میں پڑ جانے کا امکان ہوتا ہے۔

رشید صاحب اول و آخر مسلمان ہیں لیکن ایک تو خالص ہندوستانی مسلمان ہیں۔ دوسرے علی گڑھ کے ہندوستانی مسلمان ہیں۔ ان دو خصوصیات کا انہوں نے خود تذکرہ کیا ہے تا کہ آئندہ کے لیے سند رہے۔ اعتقادی اعتبار سے وہ ''شگفتگی'' کو جزو ایمان سمجھتے ہیں۔ یعنی جو جتنا شیفتۂ رسول ہوگا اتنا ہی قابل اعتماد انسان و مسلمان ہوگا۔ اس کے بعد ہندوستانی مسلمان کی مدح سرائی سنئے۔ ملاحظہ ہوں؛

''جہاں تک مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے مسلمان ہونے کا تعلق ہے ہندوستان کے مسلمان ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں سے زیادہ معتبر اور قابل تقلید ہیں نہ کہ اس کے برعکس''۔(۷)

وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ہندوستان میں بھی اس دائرے کو سمیٹ کر علی گڑھ میں مرکوز کر دینا چاہتے ہیں؛

''بہ حیثیت مجموعی ہندوستان کے مسلمانوں کی سب سے بہتر نمائندگی علی گڑھ کرتا ہے''۔(۸)

ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ تعریف سن کر دل میں مسرت کا ایک جذبہ ضرور پیدا ہوتا ہے لیکن فوراً ہی یہ سوال بھی ابھرتا ہے کہ اگر بیرونِ ہند کا مسلمان اعمال کی رو سے کمزور ٹھہرتا ہے، تو پھر دنیا و آخرت میں اس کا ٹھکانا کہاں ہے؟ رشید صاحب جس زمانے کی بات کر رہے ہیں اس زمانے میں تو بیرونِ ہند کے مسلمانوں کے پاس مال و دولت کی یہ افراط بھی نہیں تھی۔ پھر خود ہندوستان میں کشمیر سے لے کر راس کماری اور گجرات سے لے کر بنگال تک بسنے والے مسلمان علی گڑھ تہذیب کی نمائندگی نہ کریں تو اور بات لیکن ہندی اسلام کے اچھے نمائندے ہیں یہ بات ''صلح و سخاوت'' دونوں ہی معیاروں پر مشکل ہی سے اتر پائے گی۔

رشید صاحب کچھ ملائیت کو علی گڑھ تہذیب سے غیر آہنگ پاتے ہیں۔ کیونکہ یہاں خارجی مظاہر اور غیر ضروری جزئیات پر زور زیادہ ہے۔ اس معمے میں ہندستانی مسلمان کو سارے عالمِ اسلامی کا یا علی گڑھ کو اسلامی ہند کا معتبر نمائندہ سمجھنا صحیح ہے۔ رشید صاحب کا بیان اس حد تک ضرور صحیح ہے کہ علی گڑھ نے مسلم ہندوستان میں فکری روشن خیالی کی شمع پہلے پہل روشن کی اور یہ فکر کم و بیش آج بھی موجود ہے۔

ہندوستان کے فکر اسلام کے دوسرے مرکزوں میں بھی اور علی گڑھ میں بھی وہ لچک موجود ہے جس کی بدولت فکر

کی نشو ونما ہوتی ہے اور نئی راہیں کھلتی ہیں۔ اس پس منظر میں رشید صاحب کا یہ کہنا کچھ معنی رکھتا ہے:

''میں علی گڑھ کے جغرافیہ کی رو سے ایک نہایت مختصر رقبۂ زمین سمجھنے کے باوجود ثقافتی اعتبار سے اس کو نئے ہندوستان میں سماجی انصاف پر مبنی ایک مہذب انسانیت دوست سوسائٹی کے قیام و استحکام کا بڑا موثر وسیلہ سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ علی گڑھ نے شائستگی، معقول پسندی، روشن خیالی کی ان روایات کو ابتدا سے عزیز رکھا اور پروان چڑھایا۔ ایسی سوسائٹی کا قیام و استحکام اقتصادی مصلحتوں کے پیش نظر نہیں بلکہ تازی غیرت مندی کے تقاضے کے طور پر بھی ضروری ہے۔ علی گڑھ کسی کی ذاتی جاگیر نہ تھا بلکہ ہماری پوری تہذیب کا مرکز، جہاں تنگ نظری اور تنگ ظرفی کبھی دخل نہیں پا سکتی تھیں، ہر وہ بات جو وزن و وقار اور خوبصورتی سے کہی جائے یا کی جائے علی گڑھ کا حصہ تھی۔ حالؔی نے کہا تھا:

اسپ تازی کی طرح تھی قوم تازی بھی غیور

اور اقبال نے کہا:

''شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہاں داروں کی''

میں اقدار عالیہ کے حق میں ہوں، چاہے وہ کتنی ہی ضمنی یا اضافی یا متنازعہ فیہ کیوں نہ ہوں۔۔(۹)

رشید احمد صدیقی اس بات کے قائل معلوم ہوتے ہیں کہ مذہب اور تہذیب میں کوئی نزاع نہیں ہے لیکن وہیں تک کہ بات اقدار کے آگے نہ بڑھے۔ کیونکہ بعض اوقات رشید صاحب لباس تک پر بدکتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لباس کے ترک و اختیار میں بھی اقدار اعلیٰ کو دخل ہے۔ لکھتے ہیں:

''عربوں کا ایک قول ہے کہ آدمی لباس سے پہچانا جاتا ہے۔ مہذب معاشرے میں ہر موقع کے لیے لباس اور لباس کے آداب مقرر ہیں۔ لباس کے بارے میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ جو شخص جس قوم کا لباس اختیار کرے گا اسی کے ساتھ اس کا حشر ہوگا۔ اس ضمن میں غالباً دوسری قوموں سے تشبیہ کی حدیثیں بھی گردش کرتی ہونگی''(۱۰)

اسی طرح کے خیال و فکر سے رشید صاحب کی ذہنی اُلجھن شروع ہوتی ہے۔ وہ فکر کی نشو ونما کو بے حد ضروری بھی سمجھتے ہیں اور اس میں ایک ارتقائی عمل کے ہم نوا بھی ہیں۔ وہ سرسید کی فکری آزادہ روی کے معترف بھی ہیں۔ لیکن بے لچک فکری اور عقلی تقلید کے قائل بھی نظر آتے ہیں۔ بلکہ شاید اسی کو ہندی مسلمانوں کا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔ وہ تہذیب کو قدر اعلیٰ سے وابستہ اور تنگ نظری اور تنگ ظرفی سے بالاتر ہونے کو اس کی اساسی خوبی مانتے ہیں۔ وہ تہذیب کے ہر شعبہ میں وزن و وقار کے قائل ہیں۔ وہ مشرق وسطیٰ کی عرب النسل تہذیبی روایات کے قائل تو ہیں لیکن اس میں سموئے ہوئے ہندوستانی عناصر کو بھی اہمیت دینے سے نہیں ہچکچاتے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تہذیبوں کے مختلف النسل اور مختلف الفکر کردار کے حامی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کی صالح اور صحت مند زندگی کے لیے اقدار اکو اعلیٰ درجے پہ ہونا چاہئے۔ بس یہ ہو کہ وہ اقدار پائیدار اور مستقل ہوں۔ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ سائنس کی تیز رو تبدیلیاں اس عزم کو

نقصان پہنچاتی ہیں اور یقین کو متزلزل کرتی ہوئی اختلال کا باعث بنتی ہیں۔رشید صاحب اس اختلال وتزلزل سے بچنے کے لیے ماضی وتیز رفتار حال میں تطابق وتوافق ڈھونڈھنے کے حامی ہیں۔ان کے نزدیک سائنس کی حیرت انگیز اور قابل قدر کارناموں اور صنعتی یا مشینی معاشرت کو اخلاق اور زندگی سے متضاد سمجھنا اس لیے ان کو باہم دگر ہم رنگ رکھنے یا کرنے سے اپنے کو معذور سمجھنا بدنیتی یا بہ الفاظ دیگر سہل انگاری ہے۔اُن کے مطابق سائنس کی ترقی ، اخلاقی ترقی کے منافی ہو، یہ عاقبت نااندیشوں کا مسلک ہے۔سائنس کے انکشافات اور انسانیت کے تقاضوں میں تضاد نہیں توافق ڈھونڈھنا پڑے گا۔ یہ اس لیے کہ انسان کو زمین پر آباد اور خوش رکھنا مشیت کو منظور نہ ہوتا تو کرہ ارض پر قدرت کے وہ تعمیری اور تخریبی قوانین نافذ نہ ہوتے جن کی ہمہ جہت کارفرمائی ہم دیکھتے اور سنتے چلے آ رہے ہیں۔لیکن فکر ان خطوط پر تھوڑی ہی دور چل پاتی ہے کہ وہ اپنی اس تنبیہ سے پڑھنے والوں کو چونکا دیتے ہیں؛

> ’’مذہب کے دیئے ہوئے اعتقاد و احکام میں تفتیش وتفحص کے معنی ، استثنا کی اتنی گنجائش رکھتے ہوئے جتنی عموماً رکھی جاتی ہے۔بدنیتی کے ہیں۔کرید بالعموم اُس وقت پیدا ہوتی ہے۔جب دل میں اوامر سے گریز اور نواہی کا مرتکب ہونے کے لئے چور دروازوں کی تلاش کرنے اور پانے کی خواہش سر اُٹھاتی ہے‘‘(۱۱)

اعتقاد تو اعتقاد، احکام میں بھی تفتیش وتفحص سے اتنا بیزار ہو جانا کہ اسے بدنیتی کہا جائے اور اسی سانس میں سائنسی اکتشافات اور مذہب کے اقدار عالیہ میں توافق وتطابق سے گریز کو بھی بدنیتی ، بزدلی اور ناعاقبت اندیشی قرار دینا مشکل سے سمجھ میں آنے والی چیز ہے لیکن تہذیب وترقی کے تیز رو پہیے کے نیچے آ چکی ہو تو منطق آرائی کی کون سوچتا ہے۔ اس دور کے دانشوروں کے سامنے جس سے رشید صاحب کا تعلق ہے، یہ فکری تضاد ایک ناقابل تردید حقیقت اور بہت بڑا سوالیہ نشان بن کر آ چکا تھا۔رشید احمد صدیقی اپنی شگفتہ گفتاری سے اسے ڈھانپ لینا چاہتے ہیں۔لیکن بین السطور یہ سوال کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے کہ اس کا حل کیسے ڈھونڈھا جائے۔

الغرض علی گڑھ کالج رشید احمد صدیقی کے لیے صرف مادر تعلیم گاہ ہی نہ تھا بلکہ سب کچھ تھا۔محبوب تھا، رہبر تھا، معلّم اخلاق وکردار تھا،تحریر وتقریر کی جولاں گاہ تھا اور کیا کچھ نہ تھا۔اس کا دائرہ مذہب وتہذیب کی وسعت کو بھی سمیٹے ہوئے تھا۔اِس سے اُن کو جنون کی حد تک عشق تھا۔وہ سوتے جاگتے ، چلتے پھرتے کسی بھی وقت علی گڑھ کو اپنے سے جدا نہیں کر سکتے تھے۔اس کا ذرّہ ذرّہ ان کے کے لیے مہر درخشاں تھا۔ان کا جینا مرنا سب علی گڑھ ہی کے لیے تھا۔وہ اس کی عظمت وعزّت پر ہر وقت مر مٹنے کو تیار رہتے تھے۔کوئی تحریر ان کی مشکل سے ایسی ملے گی جس میں علی گڑھ کی عظمت اور وہاں کی سرگرمیوں کا والہانہ انداز میں ذکر نہ کیا گیا ہو۔

حوالہ جات

۱۔ رشید احمد صدیقی، گنج ہائے گراں مایہ (دہلی: کتابی دنیا، ۱۹۴۷ء)، ص ۲۷

۲۔ سلیمان اطہر جاوید، رشید احمد صدیقی: فن اور شخصیت، (حیدرآباد: نیشنل پریس حیدرآباد، ۱۹۷۶ء)، ص ۴۸

۳۔ رشید احمد صدیقی، سہ ماہی فکر و نظر، (علی گڑھ، جولائی ۱۹۶۳ء)، ص ۲۷

۴۔ رشید احمد صدیقی، آشفتہ بیانی میری، (علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس، ۱۹۵۸ء)، ص ۲۹

۵۔ سہ ماہی فکر و نظر، (علی گڑھ، جنوری ۱۹۶۳ء)، ص ۴۶

۶۔ عابد حسین، جدید اردو ادب، (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۷۵ء)، ص ۸

۷۔ ایضاً، ص ۲۷

۸۔ سہ ماہی فکر و نظر، (علی گڑھ، جولائی ۱۹۶۳ء)، ص ۹۲

۹۔ رشید احمد صدیقی، مضامین رشید، (دہلی: مکتبہ اردو، ۱۹۴۱ء)، ص ۳۷۱

۱۰۔ سہ ماہی فکر و نظر (علی گڑھ، اپریل ۱۹۶۲ء)، ص ۲۷

۱۱۔ آشفتہ بیانی میری، ص ۱۱۱